Research Journal
Tahqeeqat
جلد:4، شمارہ:2، 2025ء
eISSN: 2791-0342
pISSN: 2791-0334
ریسرچ جرنل
تحقیقات

مثنوی ''گلشن راز جدید'': اسلوبیاتی اور فکری تجزیہ

Masnavi''Gulshan-e-Raaz-e-Jadeed's''Stylistic and Intellectual Analysis

Dr. Talib Hussain Hashmi
Assistant Professor Urdu, (Adjunct)
Department of Urdu, MY University Islamabad
drtalibhashmi@gmail.com
Huma Hanif
M.Phil Urdu Scholar
Department of Urdu
MY University Islamabad

ڈاکٹر طالب حسین ہاشمی
اسسٹنٹ پروفیسر اُردو، (ایڈجنک)
شعبہ اُردو مائی یونیورسٹی، اسلام آباد
ہما حنیف
ایم۔فل اُردو اسکالر
شعبہ اُردو مائی یونیورسٹی، اسلام آباد

Abstract

The Gulshan-e-Raz-e-Jadeed is one of Allama Iqbal's profound poetics works that reflects his intellectual depth, spiritual insight and philosophical mastery. This paper investigates Iqbal's poetic technique and style in Gulshan-e-Raz Jadeed, highlighting the integration of classical Persian poetic tradition with modern philosophical discourse. The study analyzes how Iqbal employs the question-answer format to structure his verses, creating a dialogic framework that facilitates deeper reflection and cognitive engagement. His style combines symbolism, metaphor and powerful imagery to convey complex spiritual and philosophical ideas with clarity and eloquence. The paper further explores Iqbal's diction, rhythm, and use of Persianised vocabulary in Urdu to create a distinct aesthetic resonance, while maintaining intellectual rigour. His poetic style in this work reflects his ability to synthesise Sufi mystical themes with modern Islamic revivalist thought, creating poetry that transcends time and culture. The research concludes that Iqbal's poetic technique in Gulshan-e-Raz Jadeed is not merely aesthetic but a strategic intellectual tool to revive Islamic consciousness, selfhood, and critical awakening in his readers. This study contributes to understanding how Iqbal's unique poetic style in Gulshan-e-Raz Jadeed enhances its philosophical depth, establishing it as a masterpiece in modern Islamic and Urdu literature.

Keywords: *Iqbal, Gulshan-e-Raz Jadeed, Poetic Technique, Symbolism, Islamic Revivalism*

کلیدی الفاظ: اقبال، گلشنِ راز جدید، شاعرانہ اسلوب، علامت نگاری، اسلامی تجدید و احیاء

محمود شبستری فارسی زبان کے معروف صوفی شاعر اور حکیم تھے، جن کا اصل نام شیخ محمود بن عبدالکریم تھا۔ وہ ۱۲۸۸ء میں ایران کے صوبہ آذربائیجان کے شہر تبریز کے قریب شبستر نامی گاؤں میں پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے شبستری کہلائے۔ شبستری کا شمار ان بزرگ صوفی شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے تصوف کے دقیق موضوعات کو شعر کی سادہ، جامع اور رمز آلود زبان میں بیان کیا۔

ان کی شہرۂ آفاق تصنیف "گلشن راز" ہے جو سوال وجواب کی صورت میں لکھی گئی اور تصوف کے مشکل مسائل کا حل پیش کرتی ہے:

> "گلشن راز" کو علامہ اقبال نے اپنے کلام "گلشن راز جدید" میں مخاطب کیا اور جدید دور کے فکری سوالات کا جواب اسی طرز میں دینے کی کوشش کی۔ شبستری کا یہ کارنامہ آج بھی صوفیانہ ادب اور اسلامی فلسفہ میں ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔[۱]"

ایک مرتبہ محمود شبستری اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُس لمحے وہاں ایک سائل بھی موجود تھا، جو بہاء الدین زکریا ملتانی کے ایک مرید، امیر الحسینی کی جانب سے کچھ سوالات لے کر آیا تھا۔ ان سوالات میں تصوف، عرفان اور حقیقت وجود جیسے دقیق موضوعات شامل تھے۔ شیخ نے ان سوالات کے جوابات دینے کی ذمہ داری محمود شبستری کے سپرد کی۔ شبستری نے اپنے شیخ کے حکم کی تعمیل میں نہایت انہماک سے سائل کے سوالات سنے اور وہیں اسی مجلس میں جوابات بھی بیان کرنے لگے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے ان جوابات کو شعری قالب میں ڈھالا۔ جب پندرہ سوالات کے جوابات مکمل ہوئے تو یہ تمام کلام مجموعے کی صورت اختیار کر گیا جسے بعد میں "گلشن راز" کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب آج بھی تصوف اور عرفان اسلامی کے علمی و شعری ذخیرے میں ایک یادگار مقام رکھتی ہے، جو سوال وجواب کی صورت میں پیچیدہ فلسفیانہ مسائل کو سہل اور حسین پیرایہ اظہار عطا کرتی ہے۔[۲]

یہ بھی روایت ملتی ہے کہ درحقیقت سائل نے جو سوالات کیے تھے، ان کی تعداد سترہ تھی، تاہم محمود شبستری نے اپنی مثنوی "گلشن راز" میں ان میں سے صرف پندرہ سوالات کے جوابات قلم بند کیے۔ بعض محققین کے مطابق باقی دو سوالات یا تو سوالات کی تکرار تھے یا پھر شبستری نے انہیں اپنی حکمت عملی کے تحت شامل نہ کیا، مگر جو پندرہ سوالات وجوابات مثنوی میں شامل ہوئے، وہی اس کتاب کی علمی و عرفانی شناخت بنے۔[۳]

انھی پندرہ سوالات میں سے علامہ اقبال نے گیارہ سوالات کو منتخب کیا اور ان کا جدید انداز میں جواب دیتے ہوئے "گلشن راز جدید" تصنیف کی۔ اس کتاب میں علامہ نے ان سوالات کے جوابات کو صرف شبستری کی تقلید تک محدود نہیں رکھا بلکہ انہیں اپنے عہد کے فکری تقاضوں، اسلامی احیائی فکر اور فلسفہ خودی کی روشنی میں نئے معانی عطا کیے۔ یوں اقبال کے جوابات کئی حوالوں سے شبستری کے گلشن راز سے مختلف اور منفرد ہیں۔ انہوں نے ہر سوال کو اپنی بصیرت، علم الکلام، جدید فلسفے اور قرآن فہمی کی روشنی میں جواب دے کر "گلشن راز جدید" کو محض شرح نہیں بلکہ ایک آزاد اور تخلیقی فکری تصنیف بنا دیا۔

"گلشن راز جدید" علامہ اقبال کی ایک مختصر مثنوی ہے جس میں کل ۴۲۳ اشعار شامل ہیں، جب کہ محمود شبستری کی "گلشن راز" میں اشعار کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے۔ "گلشن راز جدید" کے آغاز میں ایک قطعہ موجود ہے وہ لمحہ جب حکیم الامت اقبال، اپنی نَفَس کی سوزش سے اہلِ مشرق کو جھنجھوڑتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی شاعری کے ذریعے تمہیں خواب غفلت سے جگا دیا ہے۔ اس کے بعد تین بندوں پر مشتمل تمہید ہے جو مثنوی کے فکری پس منظر کو واضح کرتی ہے۔ اس کے بعد اقبال نے نو سوالات بیان کیے ہیں جن کے جوابات مختلف اشعار پر مشتمل ہیں۔ درحقیقت علامہ اقبال نے محمود شبستری کے تمام سوالات کا جواب دینے کے بجائے ان میں سے گیارہ سوالات کو منتخب کر کے اپنی حکمت کے مطابق ملا کر نو سوالات کی ترتیب قائم کی۔ اس انتخاب کی حکمت یہ بتائی جاتی ہے کہ اقبال نے انہی سوالات کو اہم سمجھا جن کا تعلق انسان کی خودی، اس کی حقیقت، مقصد حیات اور عرفان الٰہی سے تھا۔ باقی سوالات زیادہ تر تصوف کی رمزی اصطلاحات اور علامتی مفاہیم کے گرد گھومتے تھے۔ ان میں یہ دریافت کیا گیا کہ چشم ولب کن حقائق کی نمائندگی کرتے ہیں، رخسار، زلف اور خال کے کیا باطنی معانی ہیں، نیز شرابِ حسن اور مے خوار کی حقیقت کیا ہے اور یہ سب علامات کن روحانی حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ علامہ اقبال کے نزدیک ان موضوعات پر

بحث ان کے اصل مقصود یعنی مسلمان کے فکری احیاء سے کم تعلق رکھتی تھی، اس لیے انہوں نے اپنے انتخاب کو انہی سوالات تک محدود رکھا جو اسلامی فکر اور فلسفہ خودی کی توضیح وتربیت کے لیے ناگزیر تھے۔"(۴)

اہلِ فکر کے لیے یہ سوال باعثِ تدبر ہے کہ علامہ اقبالؒ کو ان سوالات کے جوابات نئے سرے سے لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کا جواب خلیفہ عبدالحکیم نے ان الفاظ میں دیا ہے:

> "علامہ اقبال نے "گلشنِ راز" کے مطالعے میں یہ نکتہ اٹھایا کہ اگرچہ شبستری کی یہ مثنوی فارسی صوفیانہ ادب کا ایک عظیم شاہکار سمجھی جاتی ہے، تاہم اس میں ذات وصفاتِ الٰہیہ اور حیات وکائنات کے متعلق جو نظریات بیان کیے گئے ہیں، ان میں کئی ایسے تصورات شامل ہیں جو اقبال کے نزدیک روحِ اسلام کے منافی ہیں۔ اقبال کا اعتراض بنیادی طور پر اس بات پر ہے کہ شبستری نے بعض مقامات پر غیر اسلامی فلسفیانہ نظریات اور وحدت الوجود کے بعض ایسے عقائد کو اسلامی اصطلاحات کا لباس پہنا کر پیش کیا ہے جو حقیقی اسلامی توحید اور قرآنی فکر سے میل نہیں کھاتے۔ مثلاً شبستری کا یہ رجحان کہ کائنات اور خالق کے فرق کو مٹاتے ہوئے وحدت مطلقہ کا تصور پیش کیا جائے، اقبال کے نزدیک اسلامی فکر کے اس بنیادی اصول کے خلاف ہے جس میں خالق اور مخلوق کی جداگانہ حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اقبال کا خیال تھا کہ اس مثنوی میں بعض ایسے فلسفیانہ اور صوفیانہ افکار کو قبول کیا گیا ہے جو اسلامی تصوف کی اصل روح یعنی فعال، باعمل، اور شعور وارادہ رکھنے والے انسان کے تصور کو کمزور کر دیتے ہیں اور انسان کو محض ایک مجذوب یا فنا شدہ ہستی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس لیے اقبال نے "گلشن راز" کے بعض مباحث پر تنقید کرتے ہوئے امت کو خبردار کیا کہ صرف الفاظ اور اصطلاحات کے اسلامی ہونے سے کوئی فکر اسلامی نہیں ہو جاتی، جب تک اس کا حقیقی روحانی وفکری ڈھانچہ اسلام کے اصولِ توحید، حیات اور عمل سے ہم آہنگ نہ ہو۔ اقبال کا خیال تھا کہ ایسے نظریات انسان کو عملی زندگی سے دور کر کے صرف تجریدی فکر اور وحدت الوجود کے مبالغہ آمیز تصورات میں الجھا دیتے ہیں، جو قرآن کے فعال، تخلیقی اور باعمل انسان کے تصور سے ہم آہنگ نہیں۔ اسی وجہ سے اقبال نے "گلشن راز جدید" میں ان سوالات کے جوابات کو اسلام کے حقیقی تصور حیات، فلسفہ خودی اور فکری بیداری کی روشنی میں بیان کیا، تاکہ مسلمان اپنے آپ کو محض ماضی کے تصوف تک محدود نہ کرے بل کہ عصر حاضر کے چیلنجز کا سامنا علم، عمل، خودی اور یقین کے ساتھ کر سکے۔"(۵)

اقبال نے "گلشن راز جدید" کی تمہید میں اپنی مثنوی لکھنے کی ایک اہم وجہ یہ بیان کی ہے کہ جس طرح تبریز نے منگولوں کے طوفان کی تباہ کاریوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اسی طرح میرے سامنے مغربی تہذیب کی وہ غارت گری ہے جو عالم مشرق کے لیے چنگیز خان کے فتنہ وفساد سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ یہ جملہ اقبال کی فکر کی گہرائی کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کے نزدیک مغربی تہذیب کا مادیت پرستانہ نظام مشرق کی روحانی وفکری زندگی کو اسی طرح مٹا سکتا ہے جیسے چنگیز خان کی تلوار نے جسمانی وتمدنی تباہی پھیلائی تھی۔ علامہ اقبال کی فکر کا بنیادی ستون تصور خودی ہے۔ ان کے نزدیک خودی کی تعمیر کا مفہوم یہ ہے کہ انسان دریا میں رہتے ہوئے بھی بطور گوہر اپنی انفرادیت برقرار رکھے، یعنی خارجی اثرات اور ماحول کے دباؤ سے اپنی اصل حقیقت کو کھونے نہ دے۔ مزید برآں، خودی کا یہ تصور صرف استقامت تک محدود نہیں بل کہ اس میں ارتقا اور مسلسل ترقی کی جہت بھی شامل ہے، جس کے ذریعے انسان اپنی ذات کی تہہ در تہہ صلاحیتوں کو دریافت کر کے کمال کی منزلوں کو طے کرتا ہے اور خلافتِ ارضی کے مقصد کو حقیقی معنوں میں پورا کرتا ہے۔

چوں کہ علامہ اقبال ادب برائے ادب یا ادب برائے تفریح کے قائل نہ تھے، اس لیے وہ مثنوی کے آغاز میں ہی اپنے قاری کو تنبیہ کرتے ہیں کہ میرے اشعار کو محض شاعری نہ سمجھو، بلکہ ان کے پس پشت چھپے ہوئے عمیق مفاہیم تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اقبال واضح الفاظ میں فرماتے ہیں کہ مجھے اس بات میں کوئی جھجک یا شرمندگی محسوس نہیں ہوتی کہ میری شاعری عامیانہ تفریح یا سطحی جذبات انگیزی کے بجائے مقصدیت سے لبریز ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ عارف شاعر عطار[۶] جیسے لوگ صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں، اس لیے اگر میری شاعری میں بھی وہی حکمت و عرفان کی روشنی ملے تو یہ باعث فخر ہے نہ کہ باعثِ شرم۔ اقبال کا یہ طرزِ فکر اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ ان کی شاعری کا مقصد محض جمالیاتی تسکین یا ادبی لطف دینا نہیں بلکہ قاری کی روحانی تربیت، فکری بیداری اور خودی کی تعمیر ہے، تاکہ وہ زندگی کے حقیقی مقصد کو پہچان کر اپنی ذات کی تکمیل کر سکے:

مرا زیں شاعری خود عار ناید
کہ در صد قرن یک عطار ناید[۷]

"گلشن راز جدید": (سوالات و جوابات کی روشنی میں)

سوال نمبر ۱: فکر و تفکر جو حقیقی منزل کی طرف رہنمائی کر سکے یعنی صحیح و صالح تفکر؟

تخست از فکر خویشم در تحیر
چہ چیز است آنکہ گویندش تفکر؟
کدامن فکر ما را شرط راہ است
چرا گہ طاعت و گاہے گنہ است؟[۸]

پہلے سوال میں یہ پوچھا گیا ہے کہ فکر کیا ہے؟ یہ کب صحیح (ثواب) اور کب غلط (گناہ) ہوتی ہے؟ اور وہ کون سی چیز ہے جو انسان کو اس کی منزل مقصود تک پہنچا سکتی ہے؟

اقبال کے نزدیک اس سوال کا جواب ان کے فلسفہ خودی میں مضمر ہے۔ ان کے مطابق فکر دراصل وہ عمل ہے جس میں انسان اپنے باطن اور ظاہر، یعنی اپنے نفس اور پوری کائنات کا گہرائی سے مشاہدہ کرتا ہے۔ تاہم، اقبال اس مشاہدے کو محض عقلی سرگرمی تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اس میں وجدان کو بھی لازمی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک انفس و آفاق کا یہ مشاہدہ انسان کو اس وقت حقیقی علم عطا کرتا ہے جب عقل اور وجدان دونوں کی آنکھیں کھلی ہوں۔

اقبال فرماتے ہیں کہ اگر انسان صرف عقل کا سہارا لے تو اس کی فکر گناہ بن جاتی ہے، کیونکہ عقل محض مادی ظواہر تک محدود رہ جاتی ہے اور حقیقت کاملہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن جب عقل کے ساتھ وجدان بھی شامل ہو تو یہی فکر ثواب بن جاتی ہے اور انسان کو اس کی منزل مقصود یعنی معرفت الٰہی تک پہنچاتی ہے۔

اقبال نے بعد ازاں اپنے خطبات (Reconstruction of Religious Thought in Islam) میں بھی اس تصور کو وضاحت سے بیان کیا ہے کہ حواس خمسہ سے حاصل شدہ علم محدود ہوتا ہے، جب کہ وجدان اور روحانی ادراک حقیقت مطلقہ تک رسائی دیتے ہیں۔ انہوں نے عقل اور وجدان کو دو آنکھیں قرار دیا ہے اور واضح کیا ہے کہ انفس و آفاق کے مشاہدے میں دونوں آنکھوں کا کھلا ہونا ضروری ہے، کیونکہ ایک آنکھ بند ہو تو بصیرت ادھوری رہ جاتی ہے۔

سوال نمبر ۲: علم کیا ہے اور اس کا حاصل کیا ہے؟

چہ بحر است این کہ علمش ساحل آمد؟
ز قعر او چہ گوہر حاصل آمد؟(۹)

دوسرے سوال میں پوچھا گیا ہے کہ وہ کون سا سمندر ہے جس کا علم ساحل ہے اور اس میں غوطہ زنی سے ہمیں کیا گوہر مقصود حاصل ہوتا ہے۔ اقبال نے جواب میں لکھا ہے کہ وہ سمندر خودی ہے جس کا کنارا شعور و آگہی ہے۔ لیکن خودی (سمندر) سے مراد خودی مطلق (اللہ تعالیٰ) اور خودی مقید (انسانی خودی) ہے ان دونوں خودیوں کے تعلق کو بحر اور موج کے تعلق سے ظاہر کیا گیا ہے اور شعور و آگہی کو اس کا کنارا اس لیے کہا گیا ہے کیوں کہ کائنات کا مشاہدہ انسان شعور سے ہی کرتا ہے۔ اس پر ڈاکٹر عبدالمغنی یوں روشنی ڈالتے ہیں:

"خودی علم کے ارتکاز واستحکام کا باعث ہے۔ منبع علم خدا ہے، جو علیم وخبیر ہے۔ انسان علم کے ذریعے بھی اللہ کو پہچان سکتا ہے۔ معرفت نفس سے عرفان کائنات اور آفاق پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔ باشعور خودی حقائق سے آگاہ ہو کر لازوال اور لامکاں ہو جاتی ہے"(۱۰)

اقبال کے نزدیک خودی نہ صرف انسان کی شخصیت کا جوہر ہے بلکہ علم کے ارتکاز واستحکام کا بھی باعث بنتی ہے۔ ان کے فلسفے کے مطابق علم کا اصل منبع اللہ تعالیٰ ہے جو علیم وخبیر ہے، یعنی ہر شے کا مکمل علم رکھنے والا۔ انسان کو جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ دراصل اسی علم الٰہی کی پرتو ہے۔ اقبال یہ باور کراتے ہیں کہ انسان علم کے ذریعے اللہ کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ جب انسان معرفت نفس حاصل کرتا ہے، یعنی اپنی حقیقت کو پہچان لیتا ہے، تو وہ کائنات کی حقیقتوں سے بھی آگاہ ہو جاتا ہے۔ اسی عرفان کے ذریعے انسان کو آفاق پر تصرف اور قدرت نصیب ہوتی ہے۔ اقبال کے مطابق باشعور خودی وہ خودی ہے جو حقائق کائنات سے آگاہ ہو کر محدود زمانی ومکانی قیود سے آزاد ہو جاتی ہے اور لازوال ولامکاں کی صفات حاصل کر لیتی ہے۔ یہی خودی کی معراج ہے جس میں انسان عبدیت اور نیابت الٰہی کا حقیقی درجہ حاصل کرتا ہے۔

اقبال کے نزدیک یہ کائنات انسان کے استفادے اور تسخیر کے لیے بنائی گئی ہے۔ اگر انسان اس کائنات کا مشاہدہ اور ادراک نہ کرے تو کائنات کا وجود اپنی جگہ قائم رہے گا، مگر اس کا کوئی حقیقی مقصد اور حیثیت باقی نہیں رہے گی۔ اقبال انسان کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے انسان! اپنے اندر خدا کی صفات پیدا کر۔ جب تو اپنی حقیقت کو پہچان لے گا تو گوہر مقصود یعنی خود شناسی اور خدا شناسی حاصل کر لے گا۔ اس معرفت سے تجھے یہ احساس ہو گا کہ تیری اصل حیثیت مادی نہیں بلکہ نوری ہے۔ یہ نوری قوت تجھے زمان ومکان کی حدود سے بھی آگے لے جا سکتی ہے اور تو نئی دنیاؤں کو تسخیر کر سکتا ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ اپنی خودی کو بیدار کر کے خدا کی نیابت کا حق ادا کرے اور کائنات کو محض مشاہدے تک محدود رکھنے کے بجائے عمل، تسخیر اور تخلیق کی راہوں پر گامزن ہو۔

سوال نمبر ۳: انسان وخدا کے باہمی ربط کی صورت کیا ہے؟

وصال ممکن و واجب بہم چیست؟
حدیث قرب و بعد و بیش و کم چیست؟(۱۱)

ممکن اور واجب میں باہمی وصال کیا ہے؟ نزدیک اور دور، زیادہ اور کم کی بات کیا ہے؟ (ذات الٰہی واجب ہے اور اسکے سوا جو کچھ ہے وہ ممکن ہے عارفوں کے نزدیک صرف بندہ ہی قرب الٰہی کا خواہش مند نہیں ہوتا بلکہ اللہ بھی اپنے بندے سے رابطے کا آرزومند ہوتا ہے۔ یہ دوطرفہ وصال

کبھی اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ قربت ہو جاتی ہے اور بعض اوقات اتنا کمزور کہ آپس میں دوری کا احساس ہوتا ہے۔ کبھی وصال کم ہوتا ہے کبھی زیادہ اس کا کیا مطلب ہے۔(۱۲)

اقبال اپنے جواب میں فرماتے ہیں کہ یہ جہاں اپنی ذات میں مستقل وجود نہیں رکھتا بلکہ اس کا وجود اللہ تعالیٰ کے وجود کا محتاج ہے۔ اس لیے کائنات کا وجود حقیقی یا مستقل حیثیت کا حامل نہیں۔ اقبال انسان کو دعوت فکر دیتے ہیں کہ اگر وہ وجود حقیقی کی تلاش کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ اپنے آپ میں گم ہو جائے، یعنی اپنی خودی کی گہرائی میں اتر کر اپنے رب کی معرفت حاصل کرے۔ اقبال کے نزدیک ظاہری دنیا کی حقیقت مجازی ہے اور اصل حقیقت وہی ہے جو لامتناہی اور لازوال ہو۔ یہی تلاش انسان کو فنائے مجاز سے بقائے حقیقی کی منزل تک پہنچاتی ہے، جہاں اسے اپنی اصل حقیقت اور مقام کا شعور حاصل ہوتا ہے۔ اقبال کے نزدیک جسم وروح میں مغائرت نہیں۔ اس حوالے سے عبد السلام ندوی لکھتے ہیں:

> ”وہ روح و جسم جیسا کہ ہمارے متکلمین کا مذہب ہے ایک تسلیم کرتے ہیں اور اس صورت میں جسمانی اور روحانی طاقت ایک ہو جاتی ہے۔ بعض موقعوں پر اس کے خلاف بھی رائے دی ہے۔ تاہم ان کا اصلی میلان اسی طرف ہے کہ روح و جسم میں مغائرت نہیں، بلکہ اتحاد ہے، چنانچہ مثنوی گلشن راز جدید میں اس کو نہایت صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے“(۱۳)

علامہ اقبال اس حقیقت کو نہایت وضاحت سے بیان کرتے ہیں کہ روح اور جسم دراصل دو الگ الگ حقیقتیں نہیں ہیں بلکہ یہ ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ ان کے نزدیک جسم اور روح کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک درخت کی جڑ اور اس کی شاخیں—دونوں مل کر ہی اس درخت کی مکمل ہیئت بناتے ہیں۔ اقبال کی نظر میں مغربی فکر کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس نے حقیقتِ انسان کو صرف جسم اور مادے تک محدود کر دیا ہے اور روح کی حقیقت کو یا تو نظر انداز کر دیا یا اسے محض ایک نفسیاتی کیفیت قرار دیا۔ اسی مادہ پرستانہ نقطۂ نظر کی وجہ سے مغرب کی ساری تہذیب زمان و مکاں کے قید خانے میں مقید ہو کر رہ گئی ہے اور وہ عالم مادہ سے اوپر اٹھ کر حقیقتِ مطلقہ کا ادراک کرنے سے قاصر ہو گئی ہے۔ اقبال اس بات پر شدید افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ مغرب نے اپنی اسی محدود سوچ کی بنا پر سیاست اور مذہب کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے، حالاں کہ اسلام میں یہ دونوں شعبے ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ اس تفریق کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغرب میں انسان کی روحانی و اخلاقی اقدار کمزور پڑ گئیں۔ فرد کی زندگی محض معاشی مفادات، طاقت کے حصول اور مادی فلاح تک محدود ہو کر رہ گئی اور اس کے دل کی دنیا ویران ہو گئی۔ اقبال کے نزدیک انسان کی مکمل اور حقیقی ترقی اسی وقت ممکن ہے جب وہ جسم اور روح کو ایک وحدت کی صورت میں دیکھے اور مادہ پرستی کی زنجیروں کو توڑ کر روحانی اور اخلاقی رفعتوں کی طرف گامزن ہو۔ اقبال مسلمان کو نصیحت کرتے ہیں کہ اے مسلمان! اہل یورپ کے علم و فلسفہ کا مطالعہ ضرور کر لیکن اپنی سوچ اور فہم کو ان کی حدود تک محدود نہ کر لینا۔ اقبال انسان کو یاد دلاتے ہیں کہ تیری حقیقت محض مادہ نہیں بل کہ نور ہے، اور تیری پرواز لامکاں سے بھی آگے تک ہے۔ وہ سمجھاتے ہیں کہ اگر انسان بھی مغرب کی طرح محض مادہ پرست ہو جائے تو اس کا واجب (خدا) اور ممکن (انسان) کے قرب سے تعلق ٹوٹ جائے گا۔ لیکن اگر انسان نے اپنی معرفت کی شناخت کر لی تو وہ دراصل رب کے قرب کو پا لے گا، کیوں کہ معرفت نفس ہی معرفت رب کی کنجی ہے۔

سوال نمبر ۴: خدا و بندہ یا خدا و دنیا کی جدائی و پیوستگی کا مسئلہ کیا ہے؟

قدیم و محدث از ہم چون جدا شد
کہ این عالم شد آں دیگر خدا شد

گر معروف و عارف ذات پاک است
چہ سودا در سر ایں مشت خاک است؟(۱۴)

اقبال یہاں یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ازلی ہستی یعنی خدا اور حادث ہستی یعنی کائنات کے درمیان جدائی کیوں کر وجود میں آئی۔ اگر خدا کامل اور بے نیاز ہے تو پھر اس نے اپنے سوا کسی اور کو کیوں پیدا کیا؟ اسی سوال میں وہ یہ بھی استفسار کرتے ہیں کہ جب عارف و معروف، شاہد و مشہود سب کچھ اسی ایک ذات کی تجلی ہیں تو پھر یہ اضطراب، حیرت اور جستجو کا لامتناہی سلسلہ انسان کے دل و دماغ میں کہاں سے جنم لیتا ہے؟(۱۵)

عارفوں کے ہاں یہ تصور عام پایا جاتا ہے کہ ارواح اپنی اصل یعنی ذاتِ الٰہی سے وصال کی خواہاں رہتی ہیں اور ان کی تمام تر جدوجہد اسی ملاپ کے لیے ہوتی ہے۔ مگر علامہ اقبال اس سوال کا نہایت عمیق اور حکیمانہ جواب دیتے ہیں کہ آخر اللہ نے انسان کو خود سے جدا کیوں کیا۔ اقبال فرماتے ہیں کہ اگر انسان کی خودی یا انا خدا سے جدا ہو کر فراق کا ذائقہ نہ چکھتی تو اس کی زندگی میں نہ تو کوئی حرکت باقی رہتی، نہ حرارت۔ ان کے نزدیک زندگی کا اصل مفہوم ہی جستجو، طلب اور آرزو ہے۔ اگر یہ جدائی نہ ہوتی تو انسان کی روح میں وہ تڑپ اور اضطراب پیدا نہ ہوتا جو اسے تلاش، معرفت اور روحانی ارتقاء کی طرف لے جاتا ہے۔

اقبال مزید وضاحت کرتے ہیں کہ انسان اگر خدا کا عاشق بننے کی صلاحیت رکھتا ہے تو یہ اسی فراق کی بدولت ہے۔ یہی جدائی اس کے دل میں عشق کی آگ بھڑکاتی ہے اور عشق ہی وہ قوت ہے جو انسان کو معرفت، بصیرت اور اعلیٰ روحانی مقامات عطا کرتی ہے۔ لیکن یہاں اقبال ایک انتہائی اہم اور بنیادی نکتہ بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ انسان (انائے مقید) رب کا قرب حاصل کرتا ہے، مگر وہ اپنی انفرادیت اور خودی کو فنا نہیں کرتا۔ یعنی انسان اپنی پہچان، اختیار اور ارادے کو برقرار رکھتے ہوئے رب کے قرب سے فیض یاب ہوتا ہے۔ اقبال "عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا" کے قائل نہیں، کیونکہ ان کے نزدیک اگر قطرہ دریا میں فنا ہو کر اپنی جداگانہ حیثیت کھو دے تو اس کی حقیقت مٹ جاتی ہے۔ وہ مثال دیتے ہیں کہ جیسے سمندر اور موج دونوں کا وجود برقرار رہتا ہے؛ موج سمندر سے الگ بھی دکھائی دیتی ہے اور اسی کا حصہ بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان کی خودی، رب کے قرب سے فیض یاب ہوتے ہوئے بھی اپنا وجود قائم رکھتی ہے۔ اقبال کا یہ فلسفہ انسان کو محض فنا کی وادی میں گم ہونے کے بجائے، زندہ، باوقار اور بااختیار رہ کر خدا کا قرب حاصل کرنے کا سبق دیتا ہے، جو اسلام کے انسان دوست اور حیات افروز تصورِ بندگی کا عین ترجمان ہے۔

سوال کے دوسرے حصے میں یہ دریافت کیا گیا تھا کہ آخر انسان کے سر میں یہ کیسا سودا ہے جو اسے ہر دم بے قرار رکھتا ہے، جس کی وجہ سے وہ کبھی سکون نہیں پاتا۔ علامہ اقبال اس سوال کا نہایت عمیق اور حقیقت افروز جواب دیتے ہیں کہ یہ کوئی سودا، واہمہ یا فریبِ نظر نہیں ہے بلکہ دراصل اسی اضطراب اور بے قراری میں اس کی زندگی کا حقیقی سرچشمہ پوشیدہ ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان کا یہ اضطراب ہی دراصل عشق کی تجلی ہے۔ یہی عشق ہے جو اس کی روح میں حرارت پیدا کرتا ہے، اس کے دل کو روشن کرتا ہے، اس کے وجود کو بصیرت عطا کرتا ہے اور اسے جمود کی تاریکی سے نکال کر ارتقاء، نشوونما اور تخلیقی عمل کی راہوں پر گامزن کر دیتا ہے۔

اقبال یہ سبق دیتے ہیں کہ اگر انسان میں یہ بے قراری اور طلب نہ ہوتی تو اس کی زندگی محض ایک جامد اور بے معنی وجود بن کر رہ جاتی۔ یہی عشق ہے جو انسان کو آرزو، جستجو اور کوشش کی دولت عطا کرتا ہے اور اسے اس مقام تک لے جاتا ہے جہاں وہ اپنے رب کی معرفت، خودی کی تکمیل اور روحانی بلندی حاصل کرتا ہے۔ اقبال کی نظر میں عشق انسان کا سب سے بڑا اثاثہ ہے، جو نہ صرف اس کے دل کو زندہ رکھتا ہے بلکہ اس کی عقل و بصیرت کو بھی جلا بخشتا ہے اور اس کی ذات میں حرارتِ عمل پیدا کر کے اسے کائنات کا فعال اور باوقار خلیفہ بنا دیتا ہے۔(۱۶)

سوال نمبر۵: انا کیا ہے اور اس کا ادراک کس طرح ممکن ہے؟

کہ من باشم مرا از من خبر کن
چہ معنی دارد "اندر خود سفر کن"؟(۱۷)

یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ میں یعنی "من" یا "انا" حقیقت میں کیا ہے؟ اور جب کہا جاتا ہے کہ انسان کو اپنی ذات کے اندر سفر کرنا چاہیے تو اس کے کیا مفہوم ہیں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ظاہری شناخت اور مادی حدود سے آگے بڑھ کر اپنی باطنی حقیقت، اپنی اصل فطرت اور اپنے رب سے تعلق کو پہچانے۔ یہ inward journey دراصل خود شناسی اور خدا شناسی کی طرف سفر ہے، جس میں انسان اپنی اصل حقیقت کو دریافت کرتا ہے اور اپنے وجود کے رازوں سے پردہ اٹھاتا ہے۔ اقبال جواب میں کہتے ہیں کہ اس سے پہلے تجھے بتا چکا ہوں کہ جسم اور روح ایک دوسرے سے جدا نہیں۔ علامہ کے نزدیک انسان اپنے اندر کے سفر کے نتیجے میں زندگی کی حقیقت سے آشنا ہو کر زمان و مکاں کی حدود سے آزاد ہو جاتا ہے اور عالم لاہوت کی طرف سفر کرتا ہے۔ اقبال موت کو بھی اس سفر کا ایک مرحلہ قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ لکھتے ہیں:

"اقبال نے گلشن راز میں مرگ کو ایک واقعہ کی بجائے سلاسلہ حادثات کی ایک کڑی قرار دیا ہے۔ گویا سلسلہ مرگ سے گزرنا زندگی میں شامل ہے۔ انھوں نے اسے "سفر از خود بخود کردن" بھی کہا ہے۔ اس سفر کے ایک مرحلے کا نام مرگ ہے"۔(۱۸)

اقبال کے نزدیک زمان و مکاں انسان کی گرد راہ ہیں اور آسمان اس کی جولان گاہ۔ اقبال کا کہنا ہے کہ جب انسان اپنے باطن میں سفر کرتا ہے تو اسے جس خودی کا شعور حاصل ہوتا ہے، وہ کوئی حادثاتی یا عارضی شے نہیں بل کہ ازل سے موجود ہے۔ یہ خودی ایسی حقیقت ہے جس کا ظہور والدین یا جسمانی اسباب کے محتاج نہیں، کیوں کہ اس کی اصل ماورائے زمان و مکان ہے اور اس کا وجود خدا کی عطا کردہ ازلی حقیقت پر قائم ہے۔ یوں اقبال یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ انسان کا جسم، جو والدین کے ذریعے اس دنیا میں آیا، اس کی مکمل حقیقت نہیں ہے۔ اصل میں تو انسان کی ہستی ازل سے قائم ہے۔ اپنی اس ازلی حقیقت کو جاننے اور یہ سمجھنے کے لیے کہ اس کے وجود کا مقصود کیا ہے، ضروری ہے کہ انسان اپنی ذات کی گہرائیوں میں اترے، خود میں ڈوبے اور اپنی اصل حقیقت سے آشنا ہو۔ یہی خود شناسی دراصل خدا شناسی کی پہلی سیڑھی ہے۔

سوال نمبر۶: جزو کل کا رشتہ و مفہوم کیا ہے؟

چہ جزو است آنکہ او از کل فزون است؟
طریق جستن آں جزو چون است؟(۱۹)

پوچھا گیا ہے کہ وہ جزو کیا ہے جو کل سے بڑھ کر ہے اور اسے جزو کی تلاش کا کیا طریقہ ہے؟ اس سوال کا جواب بھی دراصل خودی کی توضیح و تشریح ہی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ خودی کی پرواز ہمارے اندازے سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ کل جو خودی سے بڑا نظر آتا ہے اس سے خودی کہیں بڑھ کر ہے۔ اہل نظر کی بصیرت میں یہ کائنات بہت مختصر ہے۔

علامہ اقبال نے اپنی مثنوی کی ابتدا میں یہ بات واضح طور پر کہی تھی کہ وہ اپنے جوابات اپنے عہد کے فتنوں اور فکری چیلنجز کو مد نظر رکھتے ہوئے دے رہے ہیں۔ اقبال کے دور میں جب سائنس دانوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ کائنات بے حد وسیع ہے اور زمین اس میں محض ایک نقطے کی حیثیت رکھتی ہے، تو اس خیال نے انسان کو کمتر اور حقیر محسوس کرانا شروع کر دیا تھا۔ مگر اقبال اس مایوسی کو رد کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انسان

اگر اپنی خودی کو پہچان لے تو وہ ایسی روحانی اور فکری طاقت حاصل کر لیتا ہے کہ پوری کائنات اس کے سامنے سمٹ کر آ جاتی ہے۔ بظاہر مجبور و لاچار دکھائی دینے والا انسان دراصل کائنات کو مسخر کرنے اور اس پر حکمرانی کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔

اقبال کے نزدیک جب انسان کی خودی بیدار اور مستحکم ہو جاتی ہے تو وہ مجبوری اور لاچاری کے مقام سے اوپر اٹھ کر مختاری، ارادے کی آزادی اور تخلیقی قوت کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اقبال یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ اس بلند مرتبے کے حصول کے لیے عشق لازم ہے۔ عشق ہی وہ آگ ہے جو خودی کو جلا بخشتا ہے، اسے زندہ اور بیدار رکھتا ہے، اور انسان کو فنا کی بجائے بقا، کمزوری کی بجائے طاقت اور لاچاری کی بجائے مختاری عطا کرتا ہے۔ اقبال اپنی مثنوی کے آخر میں یہ فیصلہ کن بات کہتے ہیں کہ بے سوز اور بے عشق زندگی دراصل موت کے مترادف ہے۔ عشق سے محروم زندگی میں نہ حرکت رہتی ہے، نہ حرارت اور نہ ارتقاء کی صلاحیت۔ جب کہ خودی آشنا لوگوں کے لیے نہ موت ہے اور نہ مجبوری و لاچاری، کیونکہ وہ زندگی کی اس سطح پر پہنچ جاتے ہیں جہاں انسان اپنے رب کی معرفت اور اپنی روح کی ابدیت کا عرفان حاصل کر لیتا ہے۔

سوال نمبر ۷: مرد کامل کون ہے؟

مسافر چون بود رہرو کدام است؟
کرا گویم کہ او مرد تمام است؟(۲۰)

اس سوال میں پوچھا گیا ہے کہ مسافر کیسا ہوتا ہے؟ راستہ چلنے والا کون ہے اور کیسے معلوم ہو کہ مرد کامل کون ہے؟ اقبال نے اس سوال کا جواب دو بندوں کی صورت میں دیا ہے۔ پہلے بند میں بتایا گیا ہے کہ خود شناسی کا سفر ہی اصل سفر ہے جو اپنی ذات میں ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ حیات جاوداں اس کی منزل ہے۔ جس نے خود کو پہچان لیا وہی مرد کامل کہلایا۔ یہاں بھی اقبال کہتے ہیں کہ اس سفر میں خدا کے حضور ثابت قدمی سے جا مگر اسکے نور کے سمندر میں ڈوب کر نیست نہیں ہو جانا، اس طرح تو نور کے اس سمندر میں اپنا وجود برقرار رکھنا۔

علامہ اقبال اگلے بند میں جمہوریت کے اس تصور پر شدید تنقید کرتے ہیں جو مغرب نے پیش کیا۔ ان کے نزدیک جمہوریت کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس نے دین اور دنیا کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ نہ تو تمہیں ملا اور شیخ کی طرح صرف دین تک محدود رہنا چاہیے کہ تمہاری نظر صرف مسجد اور مدرسے تک محدود ہو جائے، اور نہ ہی مغرب کی طرح دین کو سیاست سے الگ کر دینا چاہیے کہ تمہاری زندگی کا سارا نظام صرف مادی مفادات اور سیاسی ہتھکنڈوں پر قائم ہو۔ اقبال انسان کو مردِ کامل بننے کی دعوت دیتے ہیں، کیونکہ مرد کامل ہی وہ ہستی ہے جو دین و دنیا دونوں کے تقاضوں سے واقف اور دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کر کے چلنے والا ہوتا ہے۔

اقبال آخر میں یہ فیصلہ کن بات کہتے ہیں کہ مذہب سے خالی سیاسی نظام، خواہ وہ جمہوریت ہی کیوں نہ ہو، کبھی مرد کامل پیدا نہیں کر سکتا۔ جمہوریت انسان کو محض عددی اکثریت اور مادہ پرستانہ مفادات تک محدود کر دیتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جمہوریت خود ایک ایسی تلوار بن جاتی ہے جس کی ضرب سے تلوار چلانے والا بھی محفوظ نہیں رہتا۔ یعنی جب سیاست اور ریاست سے مذہب اور اخلاق کو جدا کر دیا جائے تو وہ نظام خود اپنے بوجھ تلے دب کر تباہ ہو جاتا ہے۔ اقبال کا پیغام یہ ہے کہ اسلام کا اصل مقصد مرد کامل کی تخلیق ہے، جو نہ صرف دنیا کی سیاست، معیشت اور معاشرت کو عدل و انصاف سے سنوارے بلکہ اپنی روحانی بصیرت سے انسانیت کو اعلیٰ ترین اخلاقی و روحانی منازل تک بھی پہنچائے۔

سوال نمبر ۸: نعرۂ "انا الحق" کا مطلب کیا؟

کہ امین نکتہ را نطق است انا الحق
چہ گوئی ہرزہ بود آن رمز مطلق(۲۱)

سوال اٹھایا گیا ہے کہ منصور حلاج[۲۲] نے جو اناالحق کا نعرہ لگایا تھا، کیا وہ بیکار بات کہی یا قابل سزا بات کہی؟ اس سوال کے جواب میں اقبال نے "انالحق" کے نعرے پر بھی اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق "انالحق" کا مفہوم یہ نہیں کہ انسان خود خدا بن جاتا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان اپنی خودی کو پوری طرح پہچان لیتا ہے تو وہ اس حقیقت تک پہنچتا ہے کہ اس کی ہستی کا اصل ماخذ اور سرچشمہ خدا ہی ہے۔ یوں انسان کی خودی میں جب کمال آتا ہے تو وہ اپنی ذات میں رب کی تجلیات کا مشاہدہ کرتا ہے، اور اسی کیفیت کو صوفیہ نے "انالحق" کے ذریعے بیان کیا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ معرفت کا اعلیٰ ترین درجہ ہے، جس میں بندہ فنا نہیں ہوتا بلکہ اس کی خودی اتنی مضبوط اور روشن ہو جاتی ہے کہ اس میں حق کا نور منعکس ہونے لگتا ہے وہاں اس کائنات کو وہم و فریب سمجھنے والوں کے خیال کی تردید کرتے ہوا اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ اقبال پہلے بند میں کہتے ہیں۔ کہ قدیم ایران کے حکما اور ہندوستان کے حکمران فلسفہ نے اس جہان اور اس میں موجود اشیا کو خواب و خیال تصور کیا۔ ان کے مطابق گمان فکر، دلیل سب خواب ہیں۔ خدا اس کائنات کو بنا کر سو گیا ہے جب وہ بیدار ہو گا تو سب فنا ہو جائے گا۔ اقبال کے مطابق اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حکماء نے صرف حواس خمسہ پر انحصار کیا۔ اقبال کہتے ہیں خودی صرف حواس خمسہ سے حاصل شدہ علم پر انحصار نہیں کرتی۔ نگاہ فریب کھا سکتی ہے مگر خودی نہیں۔ اقبال اس سے قبل خودی کے تصرف پر روشنی ڈال چکے ہیں اس لیے اس سوال کے جواب میں انھوں نے دہرانا مناسب نہیں سمجھا تاہم یہ باور کرا دیا ہے کہ انسان وہم و خواب نہیں اور نہ ہی انسان فانی ہے۔ اگر منصور حلاج نے اناالحق کہا تو اس دور کے لوگ اس بات کو نہ سمجھ سکے اور اسے یہ سمجھا کہ وہ خدا ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے مگر حقیقت میں اس نے انسانی خودی کو ایک حقیقت قرار دیا، پس اگر خودی کی جستجو ہے تو اپنے آپ میں گم ہو جا۔ اقبال انسان کو ایک حقیقت سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان "اقبال اور قرآن" میں لکھتے ہیں:

> "اقبال کا کہنا ہے کہ انسان کائنات کی ہر چیز کے وجود پر شک کر سکتا ہے، لیکن جو نفس شک کر رہا ہے، اس کا وجود خود کبھی موہوم یا باطل نہیں ہو سکتا۔ یعنی اگرچہ دنیا کی ہر شے مشتبہ اور فانی ہے، مگر انسان کا شعور، اس کا نفس، اس کی خودی ایک یقینی حقیقت ہے۔ اقبال کے نزدیک حقیقت مطلق یعنی خدا کی ذات حق ہے اور اسی طرح انسانی نفس بھی حق ہے کیوں کہ یہ اسی حقیقت مطلق کا مظہر اور اس کی تخلیق کا اعلیٰ شاہکار ہے۔"[۲۳]

سوال نمبر ۹: عرفان وحدت کیسے ہو؟

کہ شد بر سر وحدت واقف آخر؟
شناسائے چہ آمد عارف آخر؟[۲۴]

اس سوال کے جواب میں کہ وحدت کے بھید سے کون واقف ہے اور عارف کو کس چیز کی معرفت حاصل ہوتی ہے، علامہ اقبال یہ بات واضح کرتے ہیں کہ اصل عارف وہ ہے جو اس حقیقتِ مطلقہ سے آگاہ ہو جائے جس پر کائنات کی بنیاد قائم ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ اگرچہ پہاڑ، دریا، سورج، چاند اور ستارے اپنی جگہ عظیم اور حسین ہیں لیکن یہ سب فانی ہیں، ان کی حقیقت عارضی ہے اور ایک دن یہ سب فنا ہو جائیں گے۔ انسان اگر ان ظاہری جلووں میں کھو جائے تو اصل حقیقت سے محروم رہتا ہے۔ اسی لیے اقبال اپنی ایک غزل میں یہ پیغام دیتے ہیں کہ اس جہان کی ہر شے فانی ہے مگر انسان کی خودی کو لافانی بنایا جا سکتا ہے۔ خودی کی معرفت اور اس کی تربیت انسان کو وہ قوت عطا کرتی ہے جس سے وہ ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔ اقبال یاد دلاتے ہیں کہ انسان نے عالمِ ارواح میں "الست بربکم" کے سوال پر اللہ کو جواب دیا تھا "قالوا بلیٰ"، یعنی "کیوں نہیں، تو

ہی ہمارا رب ہے"۔ اس عہد کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنے رب کی معرفت حاصل کرنی ہے، اس کے حکم کو ماننا ہے اور اس دنیا کی فانی حقیقتوں سے آگے بڑھ کر اپنے وجود کی اصل حقیقت کو پہچاننا ہے۔ اقبال کا پیغام یہی ہے کہ خودی کی پرورش اور معرفتِ الٰہی انسان کو ابدیت کا مقام عطا کرتی ہے، جب کہ محض مادہ پرستی اور ظاہری چیزوں کی محبت اسے فنا کی راہوں پر ڈال دیتی ہے۔ یوں عارف کی اصل معرفت یہی ہے کہ وہ اس وحدتِ حقیقی کو پالے جو اس کائنات کا اصل سرچشمہ ہے۔

علامہ اقبال اپنی مثنوی کے اختتام پر انسان کو اس کی اصل حقیقت، مقام اور مقصدِ وجود سے آگاہ کرتے ہیں۔ وہ انسان کو محض ایک مادی شے یا بے جان دھات تصور نہیں کرتے۔ اقبال کی نظر میں انسان ایک قیمتی تلوار کی مانند ہے۔ اگر یہ تلوار نیام میں چھپی رہے تو کوئی اس کی قیمت اور طاقت سے واقف نہیں ہوتا، لیکن جب یہی تلوار نیام سے باہر آتی ہے تو اپنی کاٹ، طاقت اور جلال کو ظاہر کر دیتی ہے۔ اس مثال کے ذریعے اقبال انسان کو یہ سبق دیتے ہیں کہ جب تک وہ اپنی اصل صلاحیتوں کو استعمال میں نہیں لاتا، اس وقت تک اس کی حیثیت مخفی رہتی ہے۔

وہ اسے بتاتے ہیں کہ اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ آسمانوں کی وسعتوں کو تسخیر کر لے اور سیارگانِ فلک کو اپنا تابع بنا لے۔ یعنی انسان اگر چاہے تو علم، شعور، تحقیق، تخلیق اور روحانی بلندیوں کے ذریعے پوری کائنات کو مسخر کر سکتا ہے۔ لیکن اقبال اس مادی ترقی کو انسان کی آخری منزل نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک اصل کامیابی یہ ہے کہ انسان اپنے رب کی معرفت حاصل کرے اور حقیقتِ مطلقہ تک رسائی پائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دل کی آنکھ کو روشن کرے، اپنی باطنی بصیرت کو بیدار کرے تاکہ اسے حقیقت کا عرفان حاصل ہو سکے۔ اقبال انسان کے سامنے دو راستے رکھتے ہیں؛ ایک راستہ مغرب کی اندھی تقلید اور مادہ پرستی کا ہے جس میں انسان اپنی روحانی شناخت کو کھو بیٹھتا ہے اور فنا کی تاریکیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ دوسرا راستہ یقین اور معرفت کا ہے، جو اسے نور، فلاح اور حیات جاوداں عطا کرتا ہے۔

علامہ اقبال اپنے اختتامی پیغام میں انسان کو یہ حقیقت سمجھاتے ہیں کہ اس کی زندگی کا راستہ اور انجام اس کے اپنے اختیار میں ہے۔ وہ انسان کو بتاتے ہیں کہ اگر وہ اندھیرے، غفلت اور مادہ پرستی کی راہوں کو اپنائے گا تو وہ اپنی روحانی حقیقت سے محروم ہو کر زوال اور فنا کی تاریکیوں میں گم ہو جائے گا۔ لیکن اگر وہ یقین، علم، خود شناسی اور خدا شناسی کی روشن شاہراہ کو اختیار کرے تو وہ کامیابی، عزت، سچائی، ابدی حیات اور رب کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ اقبال کا مقصد انسان کی قوتِ عمل کو بیدار کرنا ہے تاکہ وہ اپنی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو پہچان کر زندگی کو ایک مقصد، وقار اور روشنی بخشے۔ اس طرح انسان اپنی تقدیر کا خود خالق بنتا ہے اور اس کی زندگی فلاح، عزت، سچائی اور روحانی عظمت کا آئینہ دار بن جاتی ہے۔ اقبال دراصل انسان کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ اللہ نے اسے عقل، اختیار اور ارادہ دیا ہے، اب یہ اس پر ہے کہ وہ کون سا راستہ منتخب کرتا ہے: وہ جو فنا کی طرف لے جاتا ہے یا وہ جو حقیقی بقا اور معرفتِ الٰہی تک پہنچاتا ہے۔

آخر میں، اقبال انسان کو اختیار دیتے ہیں کہ وہ خود فیصلہ کرے کہ اسے کون سا راستہ اپنانا ہے۔ اندھیرے اور فنا کا راستہ یا یقین، روشنی اور بقا کی شاہراہوں پر۔ اقبال اپنے اختتامی پیغام میں انسان کی قوتِ عمل کو بیدار کرتے ہیں، اسے خود شناسی، خدا شناسی، مقصد شناسی اور حیاتِ ابدی کے راز سے روشناس کراتے ہیں، تاکہ انسان اپنی تقدیر کا خود خالق بن سکے اور اپنی زندگی کو فلاح، عزت اور سچائی کا آئینہ دار بنا سکے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1. شبستر، شبستر ایک قصبہ ہے جو تبریز شہر سے تقریباً آٹھ فرسخ کے فاصلے پر واقع ہے۔ فرسخ قدیم مسافت کی اکائی ہے جو تقریباً تین میل کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ یہ قصبہ موجودہ دور میں ملک آذربائیجان کے مشرقی حصے میں شامل ہے۔ شبستر کو سب سے زیادہ شہرت معروف فارسی صوفی شاعر شیخ محمود شبستری ؒ کی نسبت سے حاصل ہوئی جنہوں نے اپنی شہرۂ آفاق مثنوی "گلشنِ راز" اسی خطے میں تخلیق کی۔ شبستر کا یہ علاقہ صوفیانہ فکر، فلسفے اور روحانیت کے حوالے سے ایک اہم علمی وروحانی مرکز رہا ہے۔ یہاں کے ماحول، ثقافت اور علمی روایات نے شبستری کی فکر پر گہرے اثرات ڈالے اور اسی سرزمین نے ایک ایسا صوفی شاعر پیدا کیا جس نے نہ صرف ایران بلکہ برصغیر اور عالم اسلام کی فکری روایتوں پر انمٹ نقوش چھوڑے۔ شبستر آج بھی اپنی صوفیانہ شناخت اور گلشنِ راز کے پیغام کی وجہ سے علمی وادبی حلقوں میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ تبریز شہر سے آٹھ فرسخ کے فاصلہ پر واقع ہے جو کہ موجودہ ملک آذربائی کا جان مشرقی حصہ ہے۔
2. حمید تنولی، ڈاکٹر، تصوف اور اقبالیات، لاہور: پروگریسو بکس، ۲۰۱۷ء، ص:۷۰
3. حمید اللہ ہاشمی، پروفیسر، شرح کلیات اقبال فارسی، لاہور: مکتب دانیال، س۔ن، ص:۶۳۱
4. عبد الشکور، ڈاکٹر، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۷ء، ص:۵۹۶
5. عبد الحکیم، خلیفہ، فکر اقبال، لاہور: بزم اقبال لاہور، ۲۰۱۳ء، ص:۳۴۶
6. شیخ فرید الدین عطار، جن کی ولادت 1146ء میں ایران کے شہر نیشاپور میں ہوئی، فارسی کے عظیم صوفی شاعر اور باطنی علوم کے ماہر تھے۔ عطار کا لقب انہیں ان کے پیشے کی مناسبت سے ملا کیونکہ وہ ادویات اور عطر فروخت کیا کرتے تھے۔ ان کی شاعری اور تصانیف میں روحانیت اور تصوف کا گہرا رنگ جھلکتا ہے۔ "منطق الطیر" اور "تذکرۃ الاولیاء" ان کی معروف اور لازوال کتب ہیں جو آج بھی فارسی ادب اور صوفیانہ حکمت کا قیمتی سرمایہ سمجھی جاتی ہیں۔
7. اقبال، کلیات اقبال فارسی، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، س۔ن، ص:۱۴۶
8. ایضاً، ص:۱۴۸
9. ایضاً، ص:۱۵۱
10. عبد المغنی، ڈاکٹر، اقبال کا نظریہ خودی، جہلم: بکارنر، ۲۰۱۶ء، ص:۲۵۴
11. اقبال، کلیات اقبال فارسی، ص:۱۵۴
12. حمید تنولی، ڈاکٹر، تصوف اور اقبالیات، ص ۶۱۱
13. عبد السلام ندوی، اقبال کامل، راولپنڈی: کامران پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص:۳۰۲
14. اقبال، کلیات اقبال فارسی، ص:۱۵۷
15. عبد الحکیم، خلیفہ، فکر اقبال، ص:۳۹۹
16. ایضاً، ص:۴۰۲
17. اقبال، کلیات اقبال فارسی، ص:۱۵۷
18. عبد اللہ، سید، ڈاکٹر، مرتبہ، مُتعلقات خُطبات اقبال، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع اوّل، ۱۹۷۷ء، ص:۲۴۸
19. اقبال، کلیات اقبال فارسی، ص:۱۶۴
20. ایضاً، ص:۱۷۱
21. ایضاً
22. منصور حلاج (م:۹۲۲ء) جن کا اصل نام ابو المغیث ابن منصور حلاج تھا، نویں صدی کے مشہور فارسی صوفی اور متعدد کتب کے مصنف تھے۔ ان کا پیشہ روئی دھننا تھا، اسی نسبت سے حلاج کہلائے۔ حلاج وحدت الوجود یا ہمہ اوست کے قائل تھے اور ان کا مشہور نعرہ "انا الحق" تھا، جس کا ظاہری مطلب "میں خدا ہوں" لیا گیا،

حالانکہ ان کی مراد اس سے ذاتِ حق کا عرفانی انکشاف تھا۔ ابن داوٗد اصفہانی کے فتوے پر انہیں گرفتار کیا گیا اور بالآخر پھانسی دے دی گئی۔ ان کی وفات کے بعد بعض علماء نے انہیں زندیق اور کافر قرار دیا، لیکن مولانا رومی اور فرید الدین عطار جیسے عظیم صوفی شعرا نے انہیں ولی اور شہیدِ راہِ حق تسلیم کیا۔

23. غلام مصطفٰی خان، ڈاکٹر، اقبال اور قرآن، لاہور: اقبال اکدمیپا کستان، ۲۰۱۶ء، ص۳۶۵

24. اقبال، کلیات اقبال فارسی، ص:۱۷۲

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

Roman Havalajat

1. Shabestar, Tabriz shahr se aath farsakh ka faasla par waqih hai, jo ke mojooda mulk Azerbaijan ka janub-e-mashriqi hissa hai.
2. Hamid Tanoli, Doctor, Tasawwuf aur Iqbaliyat,Lahore, Progressive Books, 2017, P:70
3. Hamidullah Hashmi, Professor, Sharh Kulyat Iqbal Farsi, Lahore, Maktab Daniyal, s.n, P:631
4. Abdul Shakur, Doctor, Iqbal ki Farsi Shayari ka Tanqeedi Jaiza, Lahore, Iqbal Academy Pakistan, 1977,P:596
5. Abdul Hakim, Khalifa, Fikr Iqbal,Lahore, Bazm-e-Iqbal Lahore, 2013, P:346
6. Sheikh Farid-ud-Din Attar, jin ki waladat 1146 mein Iran ke shahr Nishapur mein hui, Farsi ke azeem Sufi shayar aur batini uloomo ke maahir the. Attar ka laqab unhen unke peshe ki munasibhat se mila, kyunki woh adwiyaat aur itar farokht kiya karte the. Unki shayari aur tasanif mein roohaniyat aur tasawwuf ka gehra rang jhalakta hai. 'Mantiq-ut-Tair' aur 'Tazkirat-ul-Awliya' unki marhoom aur lazawal kutub hain jo aaj bhi Farsi adab aur Sufi hikmat ka qeemti jiraaz hai.
7. ,Iqbal, Kulyat Iqbal Farsi Lahore, Sheikh Ghulam Ali & Sons, s.n, P:146
8. Ibid, P:148.
9. Ibid, P:151
10. Abdul Maghni, Doctor, Iqbal ka Nazariya Khudi, Jhelum, Book Corner, 2016, P:254
11. Iqbal, Kulyat Iqbal Farsi, P:154
12. Hamid Tanoli, Doctor, Tasawwuf aur Iqbaliyat, P:611
13. Abdul Salam Nadwi, Iqbal Kamil,Rawalpindi, Kamran, Publications, 1988, P:302
14. Iqbal, Kulyat Iqbal Farsi, P: 157
15. Abdul Hakim, Khalifa, Fikr Iqbal, P:399
16. Ibid, P:402
17. Iqbal, Kulyat Iqbal Farsi, P: 157
18. Abdullah, Syed, Doctor, Muratabba, Mutaliqat Khutab Iqbal, Lahore: Iqbal Academy Pakistan, Taba-e-Awwal, 1977, P:248.
19. Iqbal, Kulyat Iqbal Farsi, P: 164
20. Ibid, P:171
21.Ibid
22. Mansoor Hallaj,(m: 922 A.H) jin ka asal naam Abu al-Magheeth Ibn Mansoor Hallaj tha, nauvin sadi ke mashhoor Farsi Sufi aur mutadid kutub ke musannif the. Unka pesha royi dhunna tha, isi nisbat se Hallaj keh laaye gaye. Hallaj wahdat al-wajood ya hama oost ke qail the aur unka mashhoor naara 'Ana al-Haq' tha, jis ka zahiri matlab 'Main Khuda hoon' liya gaya, halankeh unki marad is se zaat-e-Haq ka irfani inkashaf tha. Ibn Dawood Isfahani ke fatwe par unhein giraftar kiya gaya aur balakhir phansi de di gayi. Unki wafat ke baad kuch ulemā ne unhein zindiq aur kaafir karar diya, lekin Maulana Rumi aur Fariduddin Attar jaise azeem Sufi shoirā ne unhein wali aur shaheed-e-raah-e-Haq tasleem kiya.
23. Ghulam Mustafa Khan, Doctor, Iqbal aur Quran,Lahore, Iqbal Academy Pakistan, 2016 A.D, P:365
24. Iqbal, Kulliyat Iqbal Farsi, P:172